ڈاکٹر ارشد محمود آصف (ارشد معراج)
اسسٹنٹ پروفیسر، شعبہ اُردو
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی، اسلام آباد

پریم چند: سوز وطن اور ریاستی جبر

Prem chand is the avanguard short story writer of urdu, who has written against the states dominance. In his first short story, He propagated patriotism against the British Rule because of this, his first collection of short stories "Soz -e-Watan" was confiscated, so Prem Chand is first short story writer who raised his voice against neo-colonialism. Prem Chand's short stories reflect Socio-Political conditions of British India and he unfold the state dominance and tectics of neo-colonialism. Author of the article analyzed the first Banned collective work " Soz-e-Watan", The article also Elloborate the intellectual evolution of Prem Chand.

برصغیر پاک وہند شروع ہی سے بیرونی حملہ آوروں کی آماجگاہ رہا ہے۔حملہ آوروں نے یہاں تسلط قائم کرنے کے بعد اپنی تہذیب ،زبان اور اعتقادات کو فروغ دیا اور جن جن طبقات یا افراد نے اس سماجی ثقافتی جبر کی مخالفت کی اسے بازور دبادیا گیا۔

قدیم ہندوستان میں سب سے پہلے حملہ آور آریائی تھی جنہوں نے مقامی داروڑوں کو تباہ و برباد کرکے شمالی ہندوستان کی پہاڑیوں میں دھکیل دیا اور ہندوستان پر قابض ہوکر اپنا مذہب پھیلایا۔ ہندو مذہب دراصل تہذیب و ثقافت کا نام ہے جو آریائی اپنے ساتھ لائے تھے۔ انہوں نے ریاستی جبر کے طور پر مقامی عناصر کو ختم کیا اور اپنی زبان اور تہذیب کو رائج کرکے خود برہمن بن بیٹھے اور مقامی آبادی کو شودر اور اچھوت بنادیا۔ یہ سلسلہ رکا نہیں کیونکہ مسلم حملہ آوروں نے اس سرزمین پر حملہ آور کے روپ میں قدم جمایا اور افغانی ،ایرانی،ترکستانی اور عربی النسل مسلمان فوجوں نے ہندوستان پر پے در پے حملے کیے اور آخر مغلیہ سلطنت کا قیام عمل میں آیا۔

مغلیہ سلطنت کے قیام کے ساتھ ہی ایرانی،تہذیبی وثقافت نے رنگ جمایا اور سرکاری زبان فارسی قرار دی گئی ۔ایرانی انداز زندگی کو مثالی حیثیت دی گئی اور اسلام کی تبلیغ سرکاری سرپرستی اور صوفیاء کرام کی بدولت ہونے لگی۔مسلمانوں کے زوال کے بعد انگریز بہادر ہندوستان پر حملہ آور ہوئے۔انہوں نے بھی وہی طریقہ اپناتے ہوئے مقامی زبانوں خصوصاً

فارسی کو خیر باد کہنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ تہذیب وثقافت پر اثر انداز ہونے کے لیے مغربی ادب اور رسم و رواج اور اقدار کو فروغ دیا اور فارسی کی بجائے اردو کو رائج کیا اور مسلمانوں کو یہ باور کرایا کہ ان کی زبان اردو ہے اور ہندوؤں کی زبان ہندی ہے۔ فورٹ ولیم کالج نے اس سلسلے میں اہم کردار ادا کیا۔

اردو زبان کی صحت وصفائی کا کام شروع ہوا اور اس کھچڑی زبان میں سے عوامی مقامی عناصر کو دور کر کے ایرانی و عربی زبان و ماحول پر توجہ دی گئی (گو ایہام گوئی کی تحریک کے اختتام پر یہ عمل خان آرزو کے ہاتھوں اور پھر دبستانِ لکھنؤ کے شاعر امام بخش ناسخ کے ذریعے پہلے بھی کیا جاچکا تھا)۔ اس طرح اردو بھی ریاستی جبر کے تحت ہندوستان کی زبان بنی اور اس کا ادب بھی مغربی ادب سے متاثر تھا۔ اس لیے کئی نئی اصناف کا اضافہ ہوا اور یوں ریاستی سطح پر جبر کی مثالیں اس عہد میں عام ملتی ہیں۔

۱۹۴۷ء کے بعد بدقسمتی سے ہندوستان کے برعکس پاکستان میں وقتاً فوقتاً فوجی آمریتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ جنہوں نے جمہوریت پر قدغنیں لگائیں اور تحریر وتقریر پر مختلف پابندیاں عائد ہوتی رہیں، جس کا ادیبوں شاعروں نے تخلیقی سطح پر اپنے فن پاروں کے ذریعے اظہار کیا۔ یہ ریاستی جبر جس کی شروعات قدیم ہندوستان میں حملہ آوروں سے ہوئی ابھی تک جاری و ساری ہے۔ شاید اس دھرتی نے اور کس قدر جبر کی نئی نئی صورتیں دیکھنا ہیں۔ اس سلسلہ میں اردو افسانے کا دامن خالی نہیں ہے۔ اس کا آغاز پریم چند سے ہوتا ہے۔

رومانوی عہد کے افسانے نے سرسیّد تحریک کے خلاف بغاوت کا علم بلند کیا۔ اس عہد کے افسانے میں کوئی ایسا امر پوشیدہ یا واضح نہیں تھا کہ جس سے حکومت وقت یا کسی اور ادارے کو چیلنج کا سامنا ہو۔ دلچسپی کی بات یہ ہے کہ پریم چند کے دنیا کا انمول رتن سے قبل کا سارا ادب سامراج دشمنی کی بجائے سامراج دوستی کا اعلامیہ ہے۔ سرسیّد احمد خان نے رسالہ اسباب بغاوتِ ہند لکھ کر اِس امر کی شروعات کی ڈپٹی نذیر احمد اور دیگر رفقاء سرسیّد نے اگر براہِ راست سامراج دوستی کی مثالیں پیش نہیں کیں تو سامراج دشمنی بھی اُن کی تحریروں سے عیاں نہیں ہوتی۔ یہ سلسلہ ترقی پسند تحریک تک مسلسل ایک ہی طرح کی مفاہمت اور مصلحت پسندی کو اپنائے ہوئے ہے۔ انگریزی تعلیم کے ذریعے اشرافیہ نے سول سروسز حاصل کیں اور سامراج کے آلۂ کار بن کر اپنے ہی ہم وطنوں پر استبداد کیا۔ ''انجمن پنجاب'' کے مشاعروں کے ذریعے جس قسم کے خیالات کو اُبھارنے کی کوشش کی جا رہی تھی وہ کسی بھی طرح کے احتجاج یا ناہمواری کے بیان کی متحمل نہیں ہوسکتی تھی اس لیے بے ضرر قسم کے موضوعات پر نظم و نثر لکھنے کی حوصلہ افزائی کی گئی یہ عمل بھی زیادہ عرصہ جاری نہ رہ سکا کیونکہ ادب خاص انداز کے حکم نامے کے تحت بہت زیادہ پنپ نہیں سکتا۔ سرسیّد تحریک کی گہری مقصدیت، افادیت اور مفاہمت عدم تشدد کی بنیاد سامراج دوستی تھی اسی لیے کانگریس کے قیام کے ساتھ ہی سرسیّد احمد خان نے ''انڈین پٹریاٹک سوسائٹی'' قائم کی جس کا واضح مطلب حکامِ وقت کو اپنی وفاداریوں کا یقین دلانا تھا۔

اُردو ادب میں یہ روایت دیر تک قائم رہی یہاں تک کہ سجاد ظہیر اور اُن کے چند دوستوں نے مل کر ''انگارے'' شائع کر دی جس سے بوسیدہ اخلاقی اقدار اور رسم و رواج کو گہرے طنز کا نشانہ بنایا گیا۔

سجاد حیدر یلدرم کی رومان نویسی کے ساتھ ساتھ حقیقت پسند افسانے کا دور بھی شروع ہوتا ہے جس کے پہلے افسانہ نگار پریم چند ہیں۔ پریم چند نے اپنی ادبی زندگی کا آغاز ۱۹۰۱ء میں پہلا افسانہ دنیا کا انمول رتن لکھ کر کیا جو ۱۹۰۷ء میں اشاعت پذیر ہوا۔ اُن کے افسانوں کا اوّلین مجموعہ سوزِ وطن ۱۹۰۸ء میں زمانہ پریس کانپور سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کا مرکزی خیال وطن پرستی ہے۔ اس بارے میں سہراب اسلم لکھتے ہیں:

> پریم چند کا مجموعہ 'سوز وطن' حُب الوطنی سے لبریز تھا اور اس کی روح سامراج دشمنی تھی اس لیے اس کا گرفت میں آنا قدرتی بات تھی۔ پریم چند اس وقت محکمہ تعلیم میں سب ڈپٹی انسپکٹر مدارس تھے اور ضلع بھیر پور میں تعینات تھے اس لیے مجموعہ پر ''نواب رائے'' کا فرضی نام چھپا ہوا تھا لیکن برطانوی خفیہ پولیس نے اس ''نواب رائے'' کے پیچھے بیٹھے ہوئے ''دھنپت رائے'' کا کھوج نکالا جس کے بعد پریم چند کو ضلع کے کلکٹر کے روبرو جواب طلبی کے لیے بلا لیا گیا۔ منشی پریم چند نے کتاب کا مصنّف ہونے کا اقرار کیا۔ ڈپٹی صاحب سیخ پا ہو گئے اور بولے ''تمھاری کہانیوں میں سڈیشن (بغاوت) بھرا ہوا ہے۔ اپنی تقدیر پر خوش ہو کہ انگریزی عملداری میں ہو۔ مغلوں کا راج ہوتا تو تمہارے دونوں ہاتھ کاٹ ڈالے جاتے۔ تمہاری کہانیاں یک طرفہ ہیں۔ تم نے انگریز سرکار کی توہین کی ہے''۔ بعد میں یہ طے پایا کہ جو جلدیں ابھی فروخت نہیں ہوئی ہیں انھیں ضبط کر لیا جائے اور مصنف آئندہ محتاط رہے۔ 'سوز وطن' کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ پریم چند آغاز کار ہی سے ایک سچے وطن پرست تھے۔ سرکاری ملازم ہونے کے باوجود انھوں نے اپنے فرض کو 'پیٹ' کے تابع نہیں ہونے دیا اور آخر فروری ۱۹۲۱ء میں پریم چند نے نوکری کے جوئے کو اتار پھینکا اور وطن کی آزادی کے لیے لڑی جانے والی جنگ میں کھلے بندوں شریک ہو گئے حالانکہ انھیں اس کے نتیجے میں متعدد مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ اپنے اس فیصلے پر ہمیشہ مطمئن رہے۔[۱]

پریم چند نے اپنے عہد کی زندگی کے مسائل کو ایک انسان دوست ادیب کے نقطہ نظر سے دیکھا جس طبقے کے افراد کو انھوں نے زیادہ مظلومی اور پریشانی کے عالم میں پایا اتنی ہی زیادہ ہمدردی اور دلچسپی سے انھوں نے اس کے مسائل کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اُن کا حساس دل اور فن کارانہ ذہن مذہب و ملّت، ذات پات اور رنگ و نسل کی قیود سے ماورا تھا۔ وہ عام انسانوں کو سربلند اور آسودہ حال دیکھنا چاہتے تھے۔ کیوں کہ بقول انور سدید ''منشی پریم چند نے غربت و افلاس میں آنکھ کھولی تھی۔''[۲]

پہلی جنگِ عظیم کے بعد ہندوستان میں تحریک آزادی نے زور پکڑ لیا تھا۔ دنیا کے حالات نے ایک نئی کروٹ بدلی۔ انگریز جنگِ عظیم میں اپنی ساری طاقت کھپا چکے تھے۔ سامراجی ہتھکنڈوں میں جکڑی ہوئی غلام قومیں آزادی کے شعور سے بہرہ ور ہو چکی تھیں۔ انھیں اپنی غربت و افلاس نے یہ احساس دلایا تھا کہ اُن کی دولت کو سامراجی لوٹ کر لے جا رہے ہیں چنانچہ ان احساسات سے اُن کے اندر ایک فطری ردّعمل نے انگڑائی لی تھی۔ ہندوستان میں کانگریس نے

سیاسی سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔ شہروں اور دیہاتوں میں سیاسی بیداری کی لہر نے جنم لیا۔

۱۹۲۰ء تا ۱۹۲۲ء وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں سول نافرمانی کی تحریک غلامی کی زنجیریں کاٹنے کے لیے زوروشور سے چل رہی تھی اور اس کے تحت یو پی میں چاروں طرف کسانوں کی بغاوتوں نے انگریز سامراج کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ اس تحریک نے پورے ہندوستان کو آزادی کے شعور سے بہرہ ور کر دیا۔

پریم چند ۱۹۲۸ء تک گاندھی جی کے زیرِ اثر رہے اور انھوں نے اپنے زمانے کی اجتماعی زندگی کے بیشتر مسائل کو گاندھی جی کے نکتہ نظر سے دیکھا۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس دور کے ہندوستان کی تمام سماجی و سیاسی تحریکیں جو پریم چند کے فن کا موضوع تھیں گاندھی جی ہی کی قیادت میں آگے بڑھ رہی تھیں۔ اِس عہد میں پیداواری وسائل کی تبدیلی سے نئے طبقات اور نئی جماعتیں وجود میں آئیں۔ ان کے وسائل بھی سامنے آئے اور ہندوستان کی تہذیبی زندگی کے مختلف شعبوں میں مختلف سطحوں پر ایک نئی کشمکش کا آغاز ہوا لیکن یہ تبدیلیاں سامراجی اقتدار کی وجہ سے فطری اور منطقی نہیں تھیں چنانچہ اسی وجہ سے اس عہد کے قومی مسائل پیچیدہ ہو چکے تھے۔ ایک طرف عوام کے اقتصادی اور طبقاتی مسائل تھے تو دوسری طرف قومی آزادی کا سوال تھا۔ ایشیائی اقوام اور بالخصوص ہندوستانی عوام کو فرنگی سامراج سے شدید نفرت ہو چکی تھی اور وہ صبح آزادی کے طلوع کے لیے دل میں تڑپ اور دماغوں میں باغیانہ سوچ رکھتے تھے۔

ہندو مسلم کشیدگی بھی اِس زمانے میں ایک قومی مسئلے کی صورت اختیار کر رہی تھی۔ ہریجنوں اور ہندوستانی عورت کی مظلومی اور پستی کا مسئلہ کم اہم نہیں تھا۔ بظاہر یہ تمام مسائل جُداگانہ نوعیت رکھتے تھے لیکن قومی فکر و احساس کے نقطۂ نظر سے ان مسائل کا آپس میں گہرا ربط و تعلق بھی تھا۔ ہندوستان کا ذہن سیاسی شعور سے معمور تھا۔ عدم تعاون کی تحریک اپنے شباب پر تھی۔ اس دور میں نچلے طبقے کی اقتصادی پس ماندگی فکر و شعور کے نئے اُفق اُجاگر کر رہی تھی۔ مزدور بدحال تھا اور کسان قرض کے بوجھ تلے دبے ہوئے تھے۔ غلّے کی قیمت بہت کم ہونے کی وجہ سے کسان اپنی محنت سے بمشکل لگان ادا کرتے تھے۔

پریم چند کسانوں اور نچلے طبقے کی زندگی کے مسائل سے اچھی طرح واقف تھے۔ انھوں نے خود بھی اس تلخی کو چکھا تھا ان کے سماجی مسلک کی بنیاد انسانیت اور انسانی حقوق پر مبنی ہے۔ ان کا خیال تھا کہ ہندو سماج کا برسرِ اقتدار طبقہ صدیوں سے اِن غریبوں کو اپنا غلام بنا کر رکھ رہا ہے ان کے لیے بہتری، خوشحالی اور آسودگی کے تمام دروازے بند ہیں۔ انھیں یہ حق بھی حاصل نہیں کہ اپنے بھگوان کے سامنے جا کر اپنا دُکھ درد کہہ سکیں اس لیے کہ مندروں پر بھی تلک دھاری پنڈتوں اور سرمایہ داروں کا اجارہ ہے۔

پریم چند نے اُردو افسانہ نگاری کے رومانوی دور میں لکھنا شروع کیا۔ انھوں نے خیال و خواب کی دنیا سے حُب الوطنی، ایثار پسندی کے جذبات کو اُبھارنے کی کوشش کی اور ایک نئی زندگی کا تصوّر سامنے لائے چنانچہ اس لحاظ سے ان کا دائرہ فکر عہد حاضر تک محدود نہ رہا بلکہ انھوں نے انسانی معاشرے کے لیے ایک روشن مستقبل کی نشاندہی بھی کی۔ پریم چند

نے فرد کا آزادی سے ہمکنار ہونے کا جذبہ بھی فراہم کیا۔ انھوں نے انسانی اقدار کا احترام کیا اور ہندوستان کے مظلوم عوام کو اپنی ذات پر اعتماد کرنا سکھایا۔ انھوں نے بھوک، بیماری، بیکاری، جہالت اور توہم پرستی پر کاری ضربیں لگائیں۔ پریم چند کے اِس پہلو پر انور سدید لکھتے ہیں:

> ایک عام فرد کی ذہنی اُلجھنوں، سماجی بندشوں، معاشرتی پیچیدگیوں اور اُن سے پیدا ہونے والے سکھوں اور غموں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی۔[۳]

شروع میں پریم چند آریہ سماج تحریک سے بہت متاثر ہوئے اور افسانہ نگاری کے شوق میں وہ ہندی اور اُردو کے ترجموں کے ذریعے ٹیگور کے ادب پاروں سے شناسا ہوئے۔

یہ بات اہم ہے کہ مغربی طرز کی افسانہ نگاری سے قبل بعض مصنفوں اور خصوصاً ٹیگور کے افسانے نہ صرف ہندی بلکہ اُردو میں بھی ترجمہ ہو چکے تھے کچھ اس کے اثر سے اور کچھ مغربی طرزِ ادب کے مطالعہ اور تراجم کے زیرِ اثر اُردو میں رومانیت کا جو رجحان پرورش پا رہا تھا، پریم چند ان سے متاثر رہے اور سیاسی فضا سے بھی۔ اس زمانے میں تقسیمِ بنگال کی وجہ سے ملک میں شورش تھی۔ کانگریس میں ''گرم دل'' کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ آزادی کے ترانے گائے جا رہے تھے ان حالات میں پریم چند اپنے اوّلین مجموعے کے مقدمہ میں لکھتے ہیں:

> ہر قوم کا علم و ادب اپنے زمانے کی سچی تصویر ہوتا ہے جو خیالات قوم کے دماغوں کو متحرک کرتے ہیں اور جو جذبات قوم کے دلوں میں گونجتے ہیں وہ نظم و نثر کے صفحوں میں ایسی صفائی سے نظر آتے ہیں جیسے آئینے میں صورت۔ ہمارے لٹریچر کا ابتدائی دور وہ تھا کہ لوگ غفلت کے نشے میں متوالے ہو رہے تھے۔ اس زمانے کی ادبی یادگار بجز عاشقانہ غزلوں اور چند سفلہ قصوں کے اور کچھ نہیں۔ دوسرا دور اسے سمجھنا چاہیے جب قوم کے نئے اور پرانے خیالات میں زندگی اور موت کی لڑائی شروع ہوئی ہے اور اصلاح تمدن کی تجویزیں سوچی جانے لگیں۔ اس زمانے میں قصص و حکایات زیادہ تر اصلاح اور تجدید کے لیے ہوئے تھے۔ اب ہندوستان کے قومی خیال نے بلوغت کے زینے کی طرف ایک قدم اور بڑھایا اور حُب الوطنی کے جذبات لوگوں کے دلوں میں سر اُبھارنے لگے کیونکہ ممکن تھا کہ اس کا اثر ادب پر نہ پڑتا۔ یہ چند کہانیاں اس اثر کا آغاز ہیں اور یقین ہے کہ جوں جوں ہمارے خیال ارفع ہوتے جائیں گے۔ اس رنگ کے لٹریچر کو روزافزوں فروغ ہوتا جائے گا۔ ہمارے ملک کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت ہے کہ نئی نسل کے جگر پر حُب الوطنی کی عظمت کا نقشہ جمائیں۔[۴]

پریم چند کے افسانوں میں قومی زندگی کے متعلق ان کے دل کی ہلکی سے ہلکی دھڑکن بھی سنائی دیتی ہے یہاں تک کہ جب وہ تیز تر ہو جاتی ہے تو آشیاں بر باد جیسی کہانیوں کے روپ میں ہمارے سامنے آتی ہے اور توپ و تفنگ کے زور سے آزادی کے جذبے کو کچلنے کی کوشش کرنے والے ایک بار پھر کسی خوف سے تھرّا اٹھتے ہیں اور رسالوں کی ضمانت

ضبط کر کے یا کتابوں کی اشاعت ممنوع قرار دے کر دِل کی دھڑکن بند کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ ۱۹۳۱ء میں پریم چند کی کہانی آشیاں برباد اور ان کے افسانوں کے مجموعے سمر یاترا کے ساتھ حکومتِ وقت نے یہی سلوک کیا تھا۔ جو کہ ریاستی جبر کی واضع علامت ہے۔

جنگ عظیم اوّل کے خاتمے کے بعد برصغیر پاک و ہند میں آزادی کی لہر تیز تر ہوگئی تھی۔ سیاسی تحریکوں کے جوش و جذبے میں ہیجانی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔ اس دور میں پریم چند نے وقتی ضرورت کے تحت تاریخی اور اصلاحی افسانے تصنیف کئے جن میں قومی احساسات و جذبات کی عکاسی کی گئی اور ان جذبات کو ترفع کی راہ دکھائی گئی۔ جدوجہد آزادی کا جوش جب جنون بن گیا تو برصغیر میں ''ترک موالات'' کی فضا پیدا ہوگئی۔

انگریز حاکموں سے تعاون قومی گناہ سمجھا جانے لگا۔ تب پریم چند نے بھی ملازمت کا جوا اُتار پھینکا اور اپنی کہانیوں میں سیاسی رنگ چوکھا کر دیا۔ وطن کے جس جذبے اور ایثار و قربانی کی ضرورت تھی۔ پریم چند کے افسانوں نے اِن جذبات عالیہ کی پوری طرح پرورش کی۔ ان کے افسانوں نے آزادی کے متوالوں کے لہو کو اور زیادہ گرما دیا۔ سامراجی حاکم ظلم و نفرت کا نشانہ بن گئے تھے۔ اِن کی مفاد پرستیوں اور چیرہ دستیوں کو پریم چند کی کہانیوں نے اچھی طرح بے نقاب کیا۔ پریم چند سیاسی، سماجی، معاشی اور تہذیبی حقائق کا گہرا شعور رکھتے تھے۔ اس شعور نے ان کے افسانوں کی لو کو اور تیز کیا۔ ترقی پسند مصنفین کی تحریک ابھری تو پریم چند نے اس کی آواز پر لبیک کہا۔ اس تحریک نے جو اجتماعی شعور دیا تھا اس سے متاثر ہو کر انھوں نے پسماندہ طبقوں کی فلاح و اصلاح پر بھی توجہ دی اور مفاد پرست طبقے کے طبقاتی مفادات کی سامراجی اقتدار سے وابستگی کو بے نقاب کیا اور ریاستی جبر کے خلاف اپنی تحریروں کے ذریعے سراپا احتجاج بن گئے۔

ہندوستان کی سیاسی، سماجی اور معاشی زندگی میں انقلاب نے جس طرح کی کروٹ لی۔ پریم چند کا فکر و فن کوئی جامد شے بن کر نہ رہا بلکہ اس میں بدلتے ہوئے دور کا شعور موجود رہا۔ وطن پرستی کی تحریک چلی تو اس کی عکاسی کی۔ ماضی کی عظمت کے تذکروں کا دور آیا تو اس کی لے کے ساتھ لے ملائی۔ گاندھی کی تحریک عدم تشدد کا چلن ہوا تو اس کی ہمنوائی کی۔ عدم تشدد کو ترک کر کے تصادم کا دور آیا تو اس کے نقیب ہوئے۔ اشتراکی فکر کے زیراثر اجتماعی شعور اور انقلاب کا غلغلہ بلند ہوا تو یہ اس کے ترجمان ہوئے۔ غرض پریم چند کے افسانے اپنے عہد کی مکمل ترجمانی کرتے ہیں اور ریاستی جبر کو موضوع بناتے ہیں۔ آزادئ اظہار کے یہی پیمانے ہیں جو جبر و استبداد کے سامنے جھکتے نہیں اور نہ ہی سیاسی و سماجی قدغنوں اور ریاستی ہتھکنڈوں سے رُکتے ہیں۔

پریم چند کے بنیادی رجحان کے طور پر سیاسی اور معاشرتی اصلاح ریاستی جبر کی مخالفت اور آزادی ان کا مطمع نظر تھا کیونکہ وہ جانتے تھے کہ معاشرے میں صالح قدروں کے فروغ اور سیاسی آزادی کے بغیر انسانی خوشحالی کا تصور محض سراب ہے۔ اپنے اصلاحی مقاصد کے حصول کے لیے انھوں نے اپنے افسانوی ادب میں انھیں مسائل کو موضوع بنایا چنانچہ اُردو کے افسانوی ادب کو ایک قومی مزاج اور تہذیبی کردار عطا کیا۔ اسے ہندوستان کے کروڑوں عوام کے دِل کی دھڑکنوں سے

ہم آہنگ بنایا۔ ان کی تصانیف کے ہر ورق سے آزادئ اظہار، حب الوطنی، انسان دوستی اور ریاستی جبر کی مخالفت کا درس ملتا ہے۔ اگر ہندوستانی سماج میں ان کے افسانوی ادب کے وسیع اثرات کا مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ انھوں نے اس وسیلے سے نہ صرف یہ کہ عہد کی قدروں کی ترجمانی کی بلکہ نئی اقدار کو جنم دینے کا اعلیٰ فرض بھی سرانجام دیا۔

پریم چند کی زندگی کے متعلق وسیع نقطۂ نظر اور گہرا شعور رکھتے تھے۔ ان کی حقیقت پسندی اور اظہار کی آزادی کا اس سے بڑا اعتراف اور کیا ہوگا کہ قدامت پسندوں سے لے کر ترقی پسندوں تک سبھی ان کے فن کی اہمیت و حیثیت کے قائل ہیں۔ پریم چند کے ہاں فنکار یا ادیب کا کام صرف زندگی کو پیش کرنا ہی نہیں بلکہ جہاں زندگی کی کمی ہو، وہاں اس کی تخلیق کرنا بھی ہے اور زندگی کو تخلیق کرنے کے مرحلے پر اسے کچھ نہ کچھ آئیڈلسٹ یا رومانی بننا ہی پڑتا ہے۔ افسانہ اگر اپنے اندر اصلاح کا کوئی پہلو رکھتا ہے تو یہ اس کی خوبی ہے خامی نہیں۔ افسانہ نگار اپنے افسانوں میں اگر اپنے نظریے اور مقصد کو فنکارانہ انداز میں پیش کرتا ہے تو یہ اس کا حق ہے اور فرض بھی۔

پریم کے افسانوں کے موضوعات کا جائزہ لیں تو مندرجہ ذیل نکات زیرِ بحث آتے ہیں:

۱۔ رومانی تصورات کا نمایاں اظہار

۲۔ حب الوطنی کے جذبے کے تحت تاریخی موضوعات جن میں مغربی تہذیب و تمدن سے نفرت اور مشرقی تمدن سے محبت کی ترغیب ہے اور راجپوت بہادروں اور جیالوں کے کارنامے ہیں۔

۳۔ فرسودہ رسم و رواج اور دوسری معاشرتی برائیوں کی اصلاح۔

۴۔ سیاسی نوعیت (ریاستی جبر کی مخالفت اور آزادئ اظہار)

۵۔ آزادی کی تڑپ

ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں جلیانوالہ باغ کا واقعہ ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس واقعہ نے انگریزوں کی بربریت کے خلاف ہندوستانیوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا۔ اسی واقعہ کے ردِعمل کے طور پر عدم تعاون کی تحریک نے زور پکڑا۔

پریم چند گاندھی جی کی عدم تشدد کی حکمت عملی کے خلاف ہو گئے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ استبدادی طاقتوں کے خلاف تشدد ایک ناگزیر حربہ ہے۔ روس کی ہم عصر تاریخ ان کے سامنے تھی۔ زارِ روس کے جبر و استبداد کو روسی انقلاب کے ذریعے ختم کیا گیا تھا۔ انقلاب روس نے پریم چند کو فکری طور پر بہت متاثر کیا تھا۔ اسی دور میں انھوں نے ایسے افسانے لکھے جن میں زندگی کے واقعات کو سیاسی اثرات کے تحت پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ مثال کے طور پر جیل، بھاڑے کا ٹٹو، قاتل اور ستیہ گرہ، وغیرہ کے نام لیے جا سکتے ہیں۔ ان کے ناول تو اس دور کی سیاست کے آئینہ دار ہیں۔ اسی وجہ سے 'میدانِ عمل' کو جواہر لال نہرو کی 'میری کہانی' کی تفسیر کہا گیا۔ اس سلسلہ میں ان کا سب سے پہلا افسانوی مجموعہ انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ جس کے بارے میں پہلے بیان کیا جا چکا ہے کہ انگریز حکومت نے اس پر ریاستی جبر کے تحت

پابندی عائد کر دی تھی۔

سوزِ وطن میں کل پانچ افسانے شامل ہیں۔ پہلا افسانہ 'دنیا کا انمول رتن' داستان نما کہانی ہے۔ اس افسانے میں تخیلی محبت، ملکہ دلفریب کا حُسن، دل فگار کا جذبہ عشق، یلدرم سے بہت ملتا جلتا ہے۔ یہاں تک کہ ملکہ دل فریب کا اپنے آپ کو دل فگار کی غلامی میں دینے کے لیے شرط عائد کرنے اور دو سفروں کے دوران مشکلات ناکامی اور بزرگ سبز پوش کی رہنمائی کا تعلق ہے۔ یہ سب باتیں ان کے افسانوں کا ڈانڈا داستان سے ملاتی ہیں۔ اس افسانے میں سماجی عکس اور سیاسی حیثیت کو اُجاگر کیا گیا ہے مثلاً جب دل فگار ملکہ دلفریب کے عشق میں گرفتار ہوتا ہے اور ملکہ اس پر یہ شرط عائد کرتی ہے کہ وہ دنیا کی سب سے زیادہ بیش بہا چیز لا کر اُسے پیش کرے اور اپنا مدعا پائے۔ دل فگار اس جستجو میں چل پڑتا ہے۔ سب سے پہلے وہ ایک نازنین کو دیکھتا ہے جو اپنے شوہر کی چتا کے ساتھ چلی جاتی ہے اور دل فگار اس کی راکھ کو دنیا کی سب سے بیش بہا دولت سمجھ کر سمیٹ لیتا ہے اور ملکہ کے حضور پیش کر دیتا ہے۔ اس سلسلہ میں ڈاکٹر مسعود رضا خاکی رقم طراز ہیں:

> دل فگار نے اس خاک کو دنیا کی سب سے بیش بہا چیز سمجھ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا اور کامرانی کے نشے میں مخمور کوئے دلدار کی طرف چلا اور جب ملکہ حسن کی خدمت میں یہ تحفہ پیش کیا تو اس نے بڑی بے نیازی سے یہ کہہ کر اسے ٹھکرا دیا کہ یہ تحفہ بیش قیمت ضرور ہے لیکن دنیا کی سب سے قیمتی چیز ہرگز نہیں۔ اس جواب نے دل فگار کے جسم ناتواں کی ساری قوت سلب کر لی اور بحر یاس میں غوطے کھانے لگا لیکن محبت نے پھر جستجو کی طرف مائل کیا لیکن ہزار کوشش پر بھی گوہر مقصود ہاتھ نہ آیا تو سوچا کہ اس جینے سے مرنا بہتر ہے لیکن عین اس وقت کسی خضر راہ نے رہبری کی اور کہا کہ جا سرزمین ہند میں تیرا مقصود ہاتھ آئے گا۔ [۵]

دل فگار کو دورانِ سفر ایک نوجوان کے سینے سے خون کا فوارہ نکلتا دکھائی دیتا ہے۔ وہ بھارت کا سپاہی تھا۔ دل فگار ملکہ کی خدمت میں سپاہی کے خون کا قطرہ پیش کرتا ہے۔ ملکہ اس قطرۂ خون کو قبول کرتی ہے جو سپاہی کے سینے سے باہر نکلتا ہے۔ ایک ایسے سپاہی کے خون کا وہ آخری قطرہ جو ملک کی خاطر بہایا گیا تھا۔ وہ ایک صندوقچہ نکالتی ہے جس کے اندر رکھی لوح پر آبِ زر سے یہ لکھا ہوتا ہے ''وہ آخری قطرہ خون جو وطن کی حفاظت میں گرے دنیا کے سب سے بیش بہا قیمتی شے ہے۔'' [۶]

افسانے میں خیال کو مرکزی حیثیت حاصل ہے جو ابتداء سے آخر تک قائم رہتی ہے۔ پریم چند کا مطمع نظر وطن کی محبت کی شدّت کو دکھاتا ہے سو وہ اس امر میں انتہائی کامیاب ہوئے ہیں وطن سے محبت نو آبادیاتی عہد سے آزادیٔ اور ریاستی جبر کے خلاف مزاحمت اور اظہار کی آزادیٔ سے مملو ہے۔ یہ کہانی اپنے اسی مخصوص انداز کی وجہ سے اُردو کے اولین افسانوں میں شامل ہے۔ وطن دوستی کے حوالے سے افسانے کا سپاہی دل فگار کو اپنے پاس بٹھاتے ہوئے کہتا ہے:

> افسوس ہے تو یہاں ایسے وقت آیا جب ہم تیری مہمان نوازی کرنے کے قابل نہیں۔ ہمارے باپ دادا کا

دیس آج ہمارے ہاتھ سے نکل گیا۔ اس وقت ہم بے وطن ہیں۔ (مسکراؤ) اور گو کہ میں بے وطن ہوں مگر غنیمت ہے کہ حریف کے حلقہ میں مر رہا ہوں (سینے کے زخم سے چیتھڑا نکال کر) کیا تو نے یہ مرہم رکھ دیا۔ خون نکلنے دے۔ اسے روکنے کا فائدہ؟ کیا میں اپنے وطن میں غلامی کرنے کے لیے زندہ ہوں نہیں ایسی زندگی سے مرنا اچھا۔ ۷

سوز وطن کی دوسری کہانی 'شیخ مخمور' ہے۔ اس افسانے میں قومیت اور وطن کی محبت کے جذبے کو پیش کیا گیا ہے۔ 'شیخ مخمور' ایک ایسے شہزادے کی داستان ہے جس نے وطن پر اپنی شہزادگی کو قربان کر دیا۔ سپاہی کی طرح جنگ کی اور فقیرانہ بھیس بدل کر اپنے وطن کے بہادر سپاہیوں کی رہبری کرتا رہا۔ فقیری کے عالم میں بھی عوام کے دلوں پر اس کی حکومت قائم رہی اس لیے جب آخر میں یہ راز کھلا کہ وہی اس ملک کا حقیقی وارث ہے تو عوام خوش سے بے قابو ہو گئے۔ اس افسانے کا ایک ٹکڑا ملاحظہ ہو:

تم حق اور انصاف کی لڑائی لڑ رہے ہو۔ تمھارا جوش اتنی جلدی ٹھنڈا ہو گیا۔ کیا تمھاری تیغ انصاف کی پیاس اتنی جلدی بُجھ گئی۔ تم جانتے ہو کہ انصاف اور حق کی فتح ضرور ہو گی۔ اگر امیر ہر تدابیر کی تلوار لوہے کی ہے تو تمھارا تیغ فولاد کا ہے۔ اگر اس کے سپاہی جانباز ہیں تو تمھارے سپاہی سرفروش ہیں۔ ہاتھوں میں تیغ مضبوط پکڑ و اور نام خدا لے کر دشمن پر ٹوٹ پڑو۔ ۸

اس ٹکڑے سے پریم چند کی حق اور انصاف کے لیے تڑپ اور وطن کے لیے محبت آزادیٔ کا جذبہ صاف دکھائی دیتا ہے۔ اس مجموعے کی تیسری کہانی یہی میرا وطن ہے ہے۔ یہ ایک ایسے ہندوستانی کی کہانی ہے جو اپنے وطن کو تیس برس کی عمر میں خیر باد کہہ کر امریکہ چلا گیا تھا اور ساٹھ سال بعد نوے برس کی عمر میں واپس اپنے وطن آتا ہے۔ یہ شخص امریکہ کے اچھے دنوں، اپنی دولت ثروت، جائیداد، بیوی بچوں کی محبت کا ذکر کر کے بار بار یہ کہتا ہے کہ ان ساری مسرتوں میں رہ کر بھی جو چیز ہر وقت دل میں کانٹے کی طرح کھٹکتی تھی وہ ایک مرتبہ پھر اپنے دیس میں رہنے اور اس کی خاک میں پیوند ہونے کی آرزو تھی لیکن وہ اپنی یہ آخری آرزو لے کر بمبئی میں جہاز سے اترا اور یہاں کی زندگی کا مغربی انداز دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور وہ تڑپ کر یہ کہہ رہا تھا ''یہ میرا پیارا دیس نہیں ہے' یہ میرا پیارا دیس بھارت نہیں''۔ ریل گاڑی جنگلوں پہاڑوں اور ندیوں میدانوں کو پھلانگتی ہوئی گاؤں کے قریب پہنچی تو مسافر کی آنکھوں کے سامنے بچپن کی یادیں اٹھکیلیاں کرنے لگیں۔ وہ ایک ناقابل بیان مسرت کے ساتھ تیزی سے گاؤں کے قریب آ رہا تھا کہ اسے وہ نالہ دکھائی دیا جہاں وہ اور اس کے بچپن کے ساتھی ہنستے اور غوطے لگاتے تھے اور سامنے ایک میدان تھا جس میں دو تین انگریز بندوقیں لئے اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے اور اس کا شکستہ جھونپڑا خاکستر ہو چکا تھا لیکن اس کے آس پاس صد ہا آدمی چل پھر رہے تھے اور ان کی زبان پر عدالت اور تھانہ پولیس کی باتیں تھیں۔ محلّہ کے خوش رو اور سُرخ و سپید نوجوانوں کی جگہ اسے گرسنہ رو اور دلق پوش دکھائی دیئے تو وہ تڑپ کر چیخ اُٹھا:

''نہیں یہ میرا دیس نہیں۔ یہ دیس دیکھنے کے لیے میں اتنی دور نہیں آیا۔ یہ کوئی اور دیس ہے۔ میرا پیارا دیس نہیں۔'' ۹

اس قسم کی مایوسیوں سے دوچار ہوتا ہوا آخر وہ گنگا کے کنارے جا پہنچا ہے جہاں اس کے دل کو کچھ سکون ملتا ہے اور وہاں اس کو اپنے تصور کے مطابق وطن کی جھلک نظر آتی ہے اور وہ ایک جھونپڑی میں رہنے لگتا ہے اور اس کی یہ آرزو ہے کہ ''وہ اپنی مٹی گنگا جی کو سونپے وہ اپنے وطن میں مرے۔'' ۱۰

ڈاکٹر فردوس انور قاضی لکھتی ہیں:

اس کہانی میں بھی والہانہ انداز میں وطن کی محبت دکھانے کی کوشش ہے اور ان اثرات سے نفرت کا اظہار ملتا ہے جو انگریزی حکومت کے تسلّط اور نتیجے میں ہندوستان کی زندگی پر مرتب ہوئے تھے۔ ۱۱

کہانی کا انجام وطن کی محبت کے جذبے کو انتہا پسندی کی منزلوں تک لے جاتا ہے اور جو کہانی سچے جذبے اور حقیقت کی عکاسی سے شروع ہوتی ہے۔ آخر میں جذبات کے شدید طوفان کی نذر ہو جاتی ہے یعنی ایک شخص وطن کی محبت میں اتنا سرشار ہے کہ وطن کی محبت میں اپنے بیوی بچوں تک کو چھوڑ دیتا ہے حالانکہ اس عمل سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

صلۂ ماتم کے عنوان سے سوز وطن میں ان کا چوتھا افسانہ شامل ہے جو موضوع کے لحاظ سے پہلے افسانوں سے مختلف ہے۔ اس کے علاوہ اس میں آپ بیتی کا انداز اختیار کیا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جو کبھی ایک حسین نوجوان تھا، اپنی آپ بیتی بیان کرتا ہے۔

سوز وطن کے پانچویں افسانے عشق دنیا اور حب وطن میں اٹلی کے نامور محبّ وطن میزینی کی وطن کے لئے سخت کوشی اور مکیالین کے ساتھ اس کی محبت اور جذباتیت کے باوجود اٹلی کے لیے اس کی قربانیوں کی داستان بیان کی گئی ہے۔ اس افسانے کے بارے میں سید وقار عظیم کا خیال ہے:

.....کم از کم مصنّف کے اِس جذباتی رجحان کا حامل اور ترجمان ضرور ہے کہ اسے جس کسی کی زندگی میں اپنے وطن اور قوم کی محبت اور وطن اور قوم کے لئے جذبہ ایثار کی جھلک دکھائی دیتی ہے وہ اِس کے قدموں میں سر جھکا دیتا ہے۔ ۱۲

سوزوطن میں پریم چند نے جذبۂ حب الوطنی کو اُبھارنے کی کوشش کی ہے ان میں انگریز حکومت کی سیڈیشن نظر آتی ہے اس کی وجہ ہندوستانیوں میں حب الوطنی کا جذبہ براہ راست برطانوی حکومت کے مفاد سے ٹکراتا ہے اور وہ نہیں چاہتے تھے کہ عوام میں جذبہ حریت پیدا ہو اور وہ غلامی کی ان زنجیروں کو توڑنے کی کوشش کریں جو زنجیریں انگریزوں نے ہندوستان کو پہنائی تھیں۔ اس بارے میں سجاد ظہیر رقم طراز ہیں:

برطانوی سامراجی نظریوں کی خصوصیت کیا تھی؟ اوّل تو تمام ہندوستانیوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا کرنا کہ انگریز قوم ان سے ہر لحاظ سے بہتر ہے اور ہندوستان میں اس کی حکومت جائز اور مناسب ہے بلکہ خدا کی طرف سے نازل کی ہوئی ایک نعمت ہے۔ انگریزوں اور اُن کے وفادار رہنے پر ہندوستانی کا سیاسی اور مذہبی فرض قرار دیا گیا۔[۱۳]

انگریز منظّم طور پر یہ کوشش کر رہے تھے کہ ہندوستانی اپنی تہذیب اور زبان کے مقابلے میں اپنے وطن کی عظیم تہذیب کو گھٹیا خیال کریں اور اس کی طرف سے بے توجہی برتیں۔ مغرب کی ہر ایک چیز کو سب سے بہتر سمجھیں۔ انگریزی فیشن اور آداب کی احمقانہ نقالی کریں۔ ان خیالات کے پیدا کرنے کا مقصد یہ تھا کہ ہمیں احساسِ پستی ہو اور ہندوستان ذہنی طور پر انگریز استعمار کا آلۂ کار اور مطیع بن جائیں اس لیے انگریز مؤرخین نے انیسویں اور بیسویں صدی میں ہندوستان کی تاریخیں لکھیں، اُن میں یہی نظریہ پیش کیا گیا تھا۔ نو آبادیات کا یہی طریقہ پوری دنیا میں روا رکھا گیا۔ اس کے لیے ریاستی جبر آزادئ اظہار پر پابندی کے طریقے برتے گئے جو کہ نوآبادیات کا خاصہ رہا اس قسم کی پابندیوں اور قدغنوں سے نہ تو آزادئ اظہار کا روکا جاسکا اور نہ ہی بیداری کی تحریک کو ختم کیا جاسکا۔

پریم چند کی دوررس نگاہ نے اس بات کو شدّت سے محسوس کیا۔ یہی سبب ہے کہ ان کی ابتدائی کہانیوں میں وطن کی محبت اُبھارنے کی سعی نمایاں ہے اور یوں پریم چند حساس طبعی نے اُردو ادب میں ایک بہت بڑے افسانہ نگار کو جنم دیا۔ پریم چند کے ہاں آزادی کی تڑپ اس قدر شدید تھی کہ انھوں نے آزادئ اظہار کو استعمال کیا اور جس قدر قدغنیں بڑھتی جاتی تھیں، اُسی قدر اُن کا فن اور نقطہ نظر واضح اور بھرپور ہوتا جاتا تھا۔ یہ کمال اسی افسانہ نگار کو نصیب ہوا ہے کہ اُن کی پہلی کتاب کو انگریز حکومت نے اپنے لیے مضر سمجھا اور اس کی ضبطگی کے احکام صادر کئے لیکن ریاستی جبر کے یہ ہتھکنڈے پریم چند کے لئے مہمیز ثابت ہوئے۔ انھوں نے سیاسی جبر کے خلاف آواز بلند کی۔ پریم چند نے ہندوستانی افسانے کے ذریعے ہندوستان کی سماجی، معاشی اور سیاسی مقدرات کو بدلنے کے لیے ایک ایسی جدوجہد کا آغاز کیا جس کے بغیر نوآبادیاتی اقتدار سے آزادی کا حصول بھی لایعنی ہو گیا۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔ سہراب اسلم، منشی پریم چند اور اُردو فکشن، مشمولہ ماہنامہ عوامی منشور، مدیر اعلیٰ طفیل عباس، شمارہ نمبر۴، جلد نمبر۱۲، ماہ جولائی ۲۰۰۷ء، ص۳۰

۲۔ انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی، اشاعت چہارم، ۱۹۹۹ء، ص ۴۶۵

۳۔ انور سدید ڈاکٹر، اردو ادب کی تحریکیں، ص ۴۶۵

۴۔ محمد ارشد کیانی، پروفیسر، مرتب: پریم چند کے افسانوں کا فکری ارتقاء، مشمولہ جدید قصّہ نگاری کا ارتقاء، علمی کتاب خانہ، لاہور ۱۹۹۶ء، ص ۳۴۶

۵۔ مسعود رضا خاکی، ڈاکٹر، اُردو افسانے کا ارتقاء، مکتبۂ خیال، لاہور، پہلی بار اگست ۱۹۸۷ء، ص ۱۷۰

۶۔ پریم چند دنیا کا انمول رتن مشمولہ: سوزِ وطن زمانہ پریس کانپور، طبع اوّل جون ۱۹۰۸ء، ص۲۲
* (یہ مجموعہ نواب رائے کے قلمی نام سے شائع ہوا)

۷۔ ایضاً، ص۲۰

۸۔ پریم چند، شیخ مخمور، مشمولہ، سوزِ وطن، ص ۳۸

۹۔ ایضاً، ص۳۶

۱۰۔ ایضاً، ص۴۰

۱۱۔ فردوس انور قاضی، ڈاکٹر، اُردو افسانہ نگاری کے رجحانات، مکتبہ عالیہ لاہور، بارِ دوم، ۱۹۹۹ء، ص ۱۰۹

۱۲۔ سید وقار عظیم، پروفیسر، داستان سے افسانے تک، مشہور پریس کراچی، ۱۹۶۶ء، ۲۷۹

۱۳۔ سجاد ظہیر، روشنائی، مکتبہ دانیال، کراچی بارِ دوم جنوری ۱۹۸۶ء، ص، ۵۴

۱۴۔ سید مظہر جمیل، انگارے سے پگھلا نیلم تک، اکادمی بازیافت، کراچی، پہلی اشاعت، دسمبر ۲۰۰۵ء، ۱۱۷